



”میزان“ — توضیحی مطالعہ

قانون سیاست

(۴)

تنفیذ احکام میں حکومت کا دائرہ اختیار

”مسلمانوں کے ارباب حل و عقد اُن کو کسی جرم کے ارتکاب سے روک سکتے اور اُس پر سزا تو دے سکتے ہیں، لیکن دین کے ایجابی تقاضوں میں سے نماز اور زکوٰۃ کے علاوہ کسی چیز کو بھی قانون کی طاقت سے لوگوں پر نافذ نہیں کر سکتے۔ وہ، مثال کے طور پر، انھیں روزہ رکھنے کا حکم نہیں دے سکتے۔ اُن میں سے کسی شخص کے بارے میں یہ معلوم ہو جانے کے باوجود کہ وہ صاحب استطاعت ہے، اُسے حج پر جانے کے لیے مجبور نہیں کر سکتے۔ جہاد و قتال کے لیے جبری بھرتی کا کوئی قانون نافذ نہیں کر سکتے۔ مختصر یہ کہ جرائم کے معاملے میں اُن کا دائرہ اختیار آخری حد تک وسیع ہے، لیکن شریعت کے اوامر میں سے ان دو — نماز اور زکوٰۃ — کے سوا باقی سب معاملات میں یہ صرف ترغیب و تلقین اور تبلیغ و تعلیم ہی ہے جس کے ذریعے سے وہ مسلمانوں کی اصلاح کے لیے جدوجہد کر سکتے ہیں۔ اس طرح کے تمام معاملات میں اس کے سوا کوئی چیز اُن کے دائرہ اختیار میں نہیں ہے۔“ (میزان ۴۹۴)

مصنف کا یہ نقطہ نظر مختلف پہلوؤں سے توضیح کا متقاضی ہے۔ اس سے متعلق بنیادی تنقیح طلب نکات حسب ذیل ہیں:

۱۔ ریاست کے دائرہ اختیار سے متعلق مصنف کے نقطہ نظر کی تفصیل۔

۲۔ روایتی اہل علم کے نقطہ نظر سے مصنف کا اختلاف۔

۳۔ سورہ توبہ کی آیت سے استدلال۔

ذیل میں ان تینوں پہلوؤں سے مصنف کے موقف کی ضروری توضیح پیش کی جائے گی۔

مصنف کے نقطہ نظر کی تفصیل

اس نکتے سے متعلق مصنف کے نقطہ نظر کی تفصیلات جو ان کی دوسری تحریروں میں موجود ہیں، ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے مصنف کا پورا موقف درج ذیل نکات کی صورت میں متعین کیا جاسکتا ہے:

۱۔ ”اسلام اور ریاست — ایک جوابی بیانیہ“ کے زیر عنوان مصنف نے واضح کیا ہے کہ اسلامی شریعت میں مسلمانوں کو دو طرح کے احکام دیے گئے ہیں: ایک وہ جن کا مخاطب فرد بہ حیثیت فرد ہے اور دوسرے وہ جن کا روئے سخن مسلمان معاشرے کی طرف ہے اور جن کو روبہ عمل کرنے کی ذمہ داری نظم اجتماعی پر عائد ہوتی ہے۔ پہلی قسم کی مثال کے طور پر مصنف نے روزہ رکھنے، حج و عمرہ کے لیے جانے، ختنہ کرانے، مونچھیں پست رکھنے، خواتین کے لیے سینہ ڈھانپنے، زیب و زینت کی نمائش نہ کرنے اور سر پر اسکارف لینے جیسے معاملات کا ذکر کیا ہے۔ دوسری قسم کے احکام کے تحت مصنف نے ایک تفصیلی فہرست دی ہے جس میں مسلمانوں کے مابین عدل و انصاف کا قیام، ان کے تنازعات کا شریعت کے مطابق فیصلہ، اجتماعی عبادات میں مسلمانوں کو ضروری سہولیات مہیا کرنا، قومی املاک کا بندوبست، نماز جمعہ و عیدین کا اہتمام، معاہدات کی پابندی، جرائم پر شرعی سزاؤں کا نفاذ اور دعوت اسلام کی راہ میں رکاوٹیں دور کرنے کے لیے جہاد جیسے امور شامل ہیں۔

۲۔ مسلمانوں کا نظم اجتماعی جن ذمہ داریوں کے لیے مسئول ہے، ان میں سے ایک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی ہے۔ اس ذمہ داری کی بجا آوری کے لیے ریاستی ادارے مسلمانوں کے مابین معروفات کے فروغ اور منکرات کے سد باب کے لیے تلقین اور تعلیم و تربیت کے لیے ضروری اقدامات کرنے کے پابند ہیں۔ تاہم مسلمانوں کو قانون کی طاقت سے کسی معروف کا پابند بنانے یا کسی منکر سے باز رکھنے کا ریاستی اختیار مصنف کے نزدیک مطلق نہیں ہے، بلکہ کچھ حدود کا پابند ہے (مقامات، اسلام اور ریاست — ایک جوابی بیانیہ)۔

۳۔ جہاں تک شریعت کے ایجابی احکام، یعنی مامورات کا تعلق ہے تو ان میں سے صرف نماز اور زکوٰۃ ایسے دو امور ہیں، جن کا مطالبہ نظم اجتماعی مسلمان شہریوں سے قانون کی طاقت سے کر سکتا ہے۔ ان کے علاوہ باقی تمام

امور میں فرد صرف خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔ ان امور میں تعلیم و تربیت اور تلقین و نصیحت سے آگے حکومت کے پاس کوئی اختیار نہیں ہے اور وہ مسلمانوں کو بہ زور قانون کسی چیز کا پابند نہیں بنا سکتی (مقامات، اسلام اور ریاست — ایک جوابی بیانیہ)۔ اوپر نقل کیے گئے اقتباس میں مصنف نے اس کی مثال کے طور پر کسی مسلمان کو جبراً روزہ رکھوانے، حج پر بھیجنے یا جہاد کے لیے بھرتی کرنے جیسے امور کا ذکر کیا ہے۔

۴۔ نہی عن المنکر کے تعلق سے مصنف کے نقطہ نظر کا ایک بنیادی پہلو یہ ہے کہ ان کا مصداق مسلمہ اخلاقی برائیاں ہیں، چنانچہ ”نہی عن المنکر“ کے زیر عنوان اپنی تحریر میں مصنف نے لکھا ہے:

”اس سے مراد وہ برائیاں نہیں ہیں جو خالص مذہبی احکام کی خلاف ورزی سے پیدا ہوتی ہیں، بلکہ وہ برائیاں ہیں جنہیں پوری انسانیت بلا امتیاز مذہب و ملت برائی سمجھتی ہے۔ چوری، جھوٹ، بددیانتی، غبن، خیانت، ناپ تول میں کمی، ملاوٹ، حق تلفی، فواحش، جان، مال اور آبرو کے خلاف زیادتی اور اس نوعیت کی دوسری برائیوں کو عربی زبان میں لفظ ’منکر‘ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔“ (مقامات ۲۶۵)

دوسرا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ منکرات کی روک تھام کے لیے تعلیم و تلقین سے آگے بڑھ کر قانون کی طاقت، مسلمانوں کی حکومت صرف ان معاملات میں بروئے کار لاسکتی ہے جن کا تعلق دوسرے انسانوں کے جان و مال اور آبرو پر تعدی سے ہو۔ ان کے علاوہ دیگر منکرات میں بھی ریاست کا اختیار صرف تعلیم و تلقین تک محدود ہے۔ مصنف کے الفاظ میں:

”وہ لوگوں کو بھلائی کی تلقین کریں گے اور ان سب چیزوں سے روکیں گے جنہیں انسان ہمیشہ سے برائی سمجھتا رہا ہے۔ تاہم قانون کی طاقت اُسی وقت استعمال کریں گے، جب کوئی شخص کسی کی حق تلفی کرے گا یا اس کی جان، مال یا آبرو کے خلاف کسی اقدام کے درپے ہو گا۔“ (مقامات ۲۰۶)

۵۔ مذکورہ تمام مقدمات کی روشنی میں مصنف نے ریاست کے دائرہ اختیار کے حوالے سے اپنے نقطہ نظر کو جامع انداز میں ”قانون کی بنیاد“ کے زیر عنوان اپنی تحریر میں بیان کیا ہے۔ مصنف نے واضح کیا ہے کہ انسان کو آزاد پیدا کیا گیا ہے اور اس کے اختیار اور آزادی پر عائد کی جانے والی کسی بھی پابندی کی کوئی اخلاقی بنیاد ہونا چاہیے۔ وہ بنیاد یہی ہے کہ اگر انسان کسی دوسرے انسان کی حق تلفی کرنا چاہے یا کسی کے جان و مال یا آبرو کے خلاف کوئی اقدام کرے تو اس کی آزادی کو سلب کر لیا جائے۔ اسی اصول کی روشنی میں مصنف کے نزدیک مسلمانوں کی حکومت کو قتل، زنا، چوری، قذف اور حرابہ کی شرعی سزائیں اور اسی طرح شراب نوشی کی تعزیری سزائیں پر نافذ کرنے کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح نکاح و طلاق اور وراثت وغیرہ کے معاملات میں

اگر مسلمان شریعت کے احکام کے مطابق ایک دوسرے کے حقوق ادا نہ کریں تو ریاست کو انھیں باہمی حق تلفی سے بچانے کے لیے مداخلت کا حق حاصل ہے۔ اسی نوعیت کی مختلف قدغنیں، مثلاً کم سنی کی شادی اور پہلی بیوی کی رضامندی کے بغیر دوسری شادی پر پابندی اجتہاداً بھی عائد کی جاسکتی ہیں۔

۶۔ نظم اجتماعی کے قانونی اختیار کو مثبت پہلوؤں سے واضح کرنے کے بعد مصنف نے اس اختیار کے غلط استعمال کی بہت سی مثالوں کا بھی ذکر کیا ہے جن سے مصنف کا نقطہ نظر اطلاق و انطباق کی سطح پر بہت واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ مصنف نے لکھا ہے:

”دنیا کی ہر حکومت اور ہر قانون ساز ادارہ پابند ہے کہ وہ اپنے قانون اور ضابطوں کا جواز اسی سے ثابت کرے اور لوگوں کا حق ہے کہ وہ اُس کے بنائے ہوئے قوانین کا جائزہ لیں اور اگر دیکھیں کہ کوئی قانون یا ضابطہ اس اصول سے ہٹ کر بنایا گیا ہے تو اُسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیں۔ چنانچہ کسی حکومت نے اگر، مثال کے طور پر، یہ قانون بنایا ہے کہ لوگ اپنی مذہبی علامتوں، جیسے زنار اور صلیب اور پگڑی اور کرپان وغیرہ کا اظہار نہیں کریں گے یا بیوی کو طلاق دیں گے تو اپنے اموال کا اتنا اور اتنا حصہ لازماً اُس کے حوالے کر دیں گے یا ڈاڑھی نہیں منڈوائیں گے یا نیکر نہیں پہنیں گے یا موسیقی نہیں سنیں گے یا عورتیں نقاب نہیں پہنیں گی یا سر پر اسکارف نہیں لیں گی یا اس کے برخلاف یہ قانون بنایا ہے کہ وہ نقاب کے بغیر باہر نہیں نکلیں گی یا محرم کے بغیر حج و عمرہ کے لیے نہیں آئیں گی یا گاڑی نہیں چلائیں گی یا فلاں اور فلاں پیشہ اختیار نہیں کریں گی یا سیاست میں حصہ نہیں لیں گی یا ووٹ نہیں دیں گی تو یقیناً حد و د سے تجاوز کیا ہے۔“ (مقامات ۷۲۳)

مصنف کے بیان کردہ اصولوں کو پیش نظر رکھا جائے تو مذکورہ تمام امور حسب ذیل تفصیل کے مطابق ریاست کے دائرہ اختیار سے تجاوز قرار پاتے ہیں:

۱۔ مذہبی علامات، مثلاً زنار، صلیب اور کرپان وغیرہ کے اظہار پر پابندی اس لیے جائز نہیں کہ یہ مسلمانوں کے مذہبی عقیدے کی رو سے تو منکر ہیں، لیکن ان کی نوعیت مسلمہ اخلاقی برائیوں کی نہیں ہے۔ مصنف نے ”ریاست و حکومت“ کے عنوان سے اپنی تحریر میں واضح کیا ہے کہ غیر اسلامی شعائر و علامات کا اظہار یا غیر مسلموں کا قیام صرف جزیرہ عرب میں ممنوع ہے جسے اللہ کے ایک فیصلے کے تحت اسلام کے لیے خاص کر دیا گیا ہے (مقامات، ریاست و حکومت)۔

۲۔ بیوی کو طلاق دینے کی صورت میں اسے شوہر کے مال کے ایک مخصوص حصے کا حق دار نہ تو شریعت میں ٹھہرایا گیا ہے اور نہ میاں بیوی نے آزادانہ کسی معاہدے کے تحت یہ پابندی قبول کی ہے، اس لیے ریاست کے

پاس جبراً انھیں اس کا پابند بنانے کا اختیار حاصل نہیں ہے۔

۳۔ ڈاڑھی منڈوانا، نیکر پہننا یا موسیقی سننا مسلمہ اخلاقی برائیوں میں شامل نہیں۔ ان کا شرعی عدم جواز خود مسلمانوں کے مابین بھی متفقہ نہیں اور اگر ہو بھی تو ان میں جرم، یعنی کسی دوسرے کے حق پر زیادتی کا پہلو نہیں پایا جاتا۔ چنانچہ ان امور میں بھی حکومت زیادہ سے زیادہ ترغیب و نصیحت اور تلقین و تعلیم ہی کا طریقہ بروئے کار لاسکتی ہے۔

۴۔ خواتین کو نقاب پہننے یا سر پر اوڑھنی لینے سے روکنا بھی اسی لیے دائرۂ اختیار سے تجاوز ہے کہ سر یا چہرے کو نگار کھنانہ مسلمہ معروفات میں سے ہے اور نہ ان کو ڈھانپنا مسلمہ اخلاقی برائیوں میں شامل ہے۔

۵۔ اسی اصول پر کسی مسلمان خاتون کو نقاب پہننے کا پابند نہیں بنایا جاسکتا، کیونکہ یہ اگر شریعت کا مطلوب ہو بھی تو مسلمان ریاست نماز اور زکوٰۃ کے علاوہ کوئی ایجابی شرعی حکم جبراً نافذ نہیں کر سکتی۔ اسی طرح محرم کے بغیر سفر کرنے یا گاڑی چلانے یا سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر شریعت میں اول تو کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی اور بالفرض کی بھی گئی ہو تو ان کی پابندی کا فرد اپنی انفرادی حیثیت میں مخاطب ہے۔ چونکہ ان میں کسی دوسرے پر زیادتی یا حق تلفی کا پہلو نہیں پایا جاتا، اس لیے ریاست تعلیم و تلقین سے آگے بڑھ کر انھیں قانونی جبر سے نافذ نہیں کر سکتی۔

روایتی موقف سے اختلاف

مصنف کے مذکورہ نقطہ نظر میں اہل علم کے عمومی اور روایتی موقف سے اختلاف کے اہم پہلو دو ہیں:

پہلا یہ کہ اسلامی روایت میں سیاست شرعیہ پر کلام کرنے والے اہل علم کے ہاں اس سوال سے تصریحاً تعرض نہیں ملتا کہ احکام شرعیہ کی تنفیذ میں حکمران کا دائرۂ اختیار کیا ہے۔ البتہ ارباب حل و عقد کی دینی ذمہ داریوں کا ذکر کرتے ہوئے عموماً جن امور کا ذکر کیا جاتا ہے، ان کا تعلق عبادات میں نماز کی اقامت یا حج کی سہولیات مہیا کرنے سے اور عام معاشرتی امور میں مختلف منکرات سے ہی ہوتا ہے۔ مثلاً قاضی بدر الدین ابن جماعہ حسبہ کے ریاستی شعبے کے وظائف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

الحسبة وحققتها ولاية الأمر
بالمعروف والنهي عن المنكر... والذي
عليه من الوظائف فثلاثة أنواع:

”حسبہ کی حقیقت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر
کے اختیار کو بروئے کار لانا ہے۔ محتسب کی
ذمہ داریاں تین قسم کی ہیں: پہلی قسم حقوق اللہ

الأول حقوق الله تعالى، فينظر من يخل بالواجبات من الطهارة والصلوات والجمعة والجماعات، ومن يرتكب المنكرات كإظهار المحرمات وشرب المسكرات وكشف العورات لاسيما في الحمامات، فيزجر فاعل ذلك ويؤدبه بما يقتضيه الحال - النوع الثاني: حقوق العباد المختصة، وهو النظر في الموازين والمكايل وصحتها على العرف المألوف في بلده ... النوع الثالث: ما يشترك فيه حق الله تعالى وحق العباد، ومنه النظر في الأرقاء والسادة وما يلزمهم شرعاً وعادة ... ومنه النظر في أهل الذمة.

(تحرير الاحكام في تدبير اهل الاسلام ٩٢)

سے متعلق ہے، چنانچہ محتسب ان لوگوں پر نظر رکھے گا جو دینی واجبات، مثلاً طہارت، نماز، جمعہ اور جماعات کی بجا آوری نہ کریں اور جو منکرات کا ارتکاب کریں، جیسے سرعام حرام کاموں کا ارتکاب اور نشہ آور مشروبات پینا اور برہنگی کا اظہار کرنا، خصوصاً اجتماعی غسل خانوں میں۔ محتسب موقع و محل کے مطابق ایسے لوگوں کی زجر و تادیب کرے گا۔ دوسری قسم کا تعلق بندوں کے باہمی حقوق سے ہے، مثلاً ماپ تول کے پیمانوں پر نظر رکھنا اور اس کو یقینی بنانا کہ وہ اس علاقے کے معروف پیمانوں کے مطابق ہوں۔ تیسری قسم ان امور کی ہے جن میں اللہ کا حق اور بندوں کا حق، دونوں پائے جاتے ہیں۔ اسی کی قبیل سے غلاموں اور ان کے مالکوں کے معاملات پر نظر رکھنا اور ان پر شرعاً و عرفاً جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، ان کو یقینی بنانا ہے۔ اہل ذمہ کے معاملات کی نگرانی بھی اسی کے تحت آتی ہے۔“

تاہم اس حوالے سے، خصوصاً خلفائے راشدین کے طرز عمل سے جو تصویر سامنے آتی ہے، وہ کچھ یوں ہے کہ سیدنا عمر عصر کے بعد مسجد میں نوافل ادا کرنے والوں کو درے لگایا کرتے تھے (مسلم، رقم ۸۳۶)۔ آپ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کا تہ بند ٹخنوں سے نیچے ہے تو قینچی منگوا کر ٹخنوں سے نیچے اس کے تہ بند کو کاٹ دیا (مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۴۸۸۱)۔ ایک شخص کو سونے کی انگوٹھی پہنے ہوئے دیکھا تو اسے درہ لگا دیا (مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۵۱۹۸)۔ حضرت عمر اور حضرت عثمان، دونوں سے متعلق منقول ہے کہ وہ ایسی خواتین کو جو دوران عدت میں حج کے لیے نکلی ہوں، راستے سے واپس بھیج دیتے تھے (سنن سعید بن منصور، رقم ۱۳۴۴)۔

مصنف عبدالرزاق، رقم ۱۲۰۷۱۔ ان کی طرف سے امہات المؤمنین کو حج یا عمرے کے سفر پر از خود جانے کی اجازت نہیں تھی، اور اس کے لیے انھیں سیدنا عمر سے اجازت لینا پڑتی تھی (ابن حجر، فتح الباری ۴/۳۳-۴۴)۔ انھوں نے نصر بن الحجاج نامی ایک نوجوان کا سر منڈوا دیا، کیونکہ وہ بہت خوب صورت تھا اور مدینے کی خواتین اس کے نام سے عشقیہ شاعری کرنے لگی تھیں۔ پھر انھوں نے اس کو مدینہ سے جلا وطن کر کے بصرہ بھیج دیا (ابن سعد، الطبقات الکبریٰ ۳/۲۱۶۔ ابن عساکر، تاریخ دمشق ۲۱/۶۲)۔ اسی طرح سیدنا عثمان نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے گھروں سے نزد کو نکال دیں، ورنہ وہ ان کے گھروں کو جلادیں گے (بیہقی، السنن الکبریٰ ۱۰/۲۱۵)۔ انھوں نے ایک شخص کو مامور کیا کہ جو لوگ کبوتر اڑاتے ہوں یا جلاہق کھیلتے ہوں، ان کے کبوتروں کے پر کاٹ دیں اور جلاہق کو توڑ دیں (ابن کثیر، البدایہ والنہایہ ۷/۲۱۴)۔

اس تناظر میں اسلامی روایت اصولی طور پر حکمران کے اختیار کو کسی خاص اور متعین ضابطے کا پابند نہیں کرتی۔ یوں مصنف کا نقطہ نظر اس سوال کے حوالے سے روایتی دینی تفہیم سے کافی مختلف ہو جاتا ہے۔ اختلاف کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ مصنف نے حکومت کے دائرہ اختیار کو منکرات کے ضمن میں صرف جرائم سے متعلق قرار دیا ہے جس سے مصنف کی مراد حقوق العباد پر تعدی کی نوعیت رکھنے والے جرائم ہیں۔ یہ نقطہ نظر بھی روایتی فقہی موقف سے مختلف ہے۔ روایتی اہل علم نہ صرف ارتداد کی سزا کو حدود میں شمار کرتے اور مرتد کے خلاف قانونی اقدام کو مسلمان حکومت کی ذمہ داری قرار دیتے ہیں، بلکہ اس کے علاوہ عمومی طور پر بدعات کے خاتمہ اور مختلف بدعتی گروہوں کی سرکوبی کو بھی مسلمان حکمران کی دینی ذمہ داریوں میں شمار کرتے ہیں (دیکھیے: الجوبینی، غیاث الامم ۳۲۹-۳۳۰)۔

ارتداد سے متعلق مصنف کا نقطہ نظریہ ہے کہ اس کی سزا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے براہ راست مخاطبین میں سے مشرکین عرب کے لیے قانون اتمام حجت کے تحت بیان کی گئی تھی اور مشرکین عرب ہی کے ساتھ خاص ہے۔ اس دائرے سے باہر، ارتداد اختیار کرنے والے کسی شخص کو سزا دینے کا اختیار اسلامی حکومت کو حاصل نہیں ہے۔ مزید برآں، دین کے بنیادی تصورات اور احکام میں تحریف یا بدعت جیسے منکرات کے خلاف ریاستی طاقت کے استعمال کو بھی مصنف درست نہیں سمجھتے۔ اس ضمن میں کسی قول یا عمل کی بنیاد پر کسی کی تکفیر کرنے، یعنی اسے قانونی طور پر غیر مسلم قرار دینے کے متعلق مصنف کا نقطہ نظر گزشتہ صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ اس کو ریاست کے دائرہ اختیار میں شامل نہیں سمجھتے۔ مصنف کے نزدیک یہ دائرہ بھی دین کی شرح و وضاحت

اور دعوت و تلقین سے ہی تعلق رکھتا ہے۔

سورۃ توبہ کی آیت سے استدلال

مذکورہ نقطہ نظر کے حق میں مصنف نے سورۃ توبہ کی آیت ۵ سے استدلال کیا ہے، جس میں مشرکین عرب سے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ جب وہ شرک سے توبہ کر کے نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی پابندی قبول کر لیں تو ان کی راہ چھوڑ دی جائے۔ یہ ایک منفرد استنباط ہے۔ قدیم یا جدید اسلامی روایت میں اس آیت سے حکومتی دائرۂ اختیار سے متعلق کوئی ضابطہ اخذ کرنے کی کوئی نظیر بظاہر نہیں ملتی۔ مفسرین نے عموماً اس کو اس پر محمول کیا ہے کہ یہ شرائط پوری کرنے پر مشرکین کو جان و مال کی امان حاصل ہو جائے گی اور ان کے لیے معمول کی نقل و حرکت جائز ہو جائے گی۔ نواب صدیق حسن خان اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

(فخلوا سبیلہم) أي اترکوکھم وشأنہم
 ”ان کا راستہ چھوڑ دو“ کا مطلب یہ ہے کہ
 فلا تأسروہم ولا تحصرہم ولا تقتلوہم
 ان پر کوئی پابندی نہ لگاؤ، ان کو قید نہ کرو، نہ ان کا
 ولا تمنعہم من الدخول إلى مکة
 محاصرہ کرو، نہ قتل کرو اور نہ مکہ میں داخل ہونے یا
 والتصرف فی بلادہم ولا تتعرضوا لہم۔
 اپنے ملک میں نقل و حرکت سے روکو اور نہ انھیں
 (فتح البیان) کسی بھی طریقے سے تنگ کرو۔“

اسی سے اہل علم یہ عمومی ضابطہ بھی اخذ کرتے ہیں کہ اگر غیر مسلم دائرۃ اسلام میں داخل ہونا چاہیں تو اس کے لیے اقرار شہادت کے ساتھ ساتھ نماز اور زکوٰۃ کا اہتمام بھی ضروری ہے۔ تاہم اہل علم کے نزدیک نماز اور زکوٰۃ کا ذکر یہاں جامع مانع شرائط کے طور پر نہیں، بلکہ قبول اسلام کی دو بڑی علامات کے طور پر ہوا ہے۔ امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ یہاں خاص طور پر ان دو نمایاں اور ظاہر فرائض کا ذکر کیا گیا ہے جن کو اگر مسلمانوں کا کوئی گروہ ترک کرنا چاہے تو اس کے خلاف قتال کیا جاسکتا ہے۔ ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ دیگر عبادات، مثلاً وضو اور غسل یا روزہ وغیرہ پوشیدہ امور ہیں جن کی ظاہری تحقیق نہیں ہو سکتی، اس لیے ظاہری طور پر کسی گروہ کو مسلمان شمار کرنے کے لیے نماز اور زکوٰۃ کے اہتمام کو ہی شرط قرار دیا گیا ہے (مجموع الفتاویٰ ۷/۶۰۷-۶۰۸)۔

مولانا شبیر احمد عثمانی کے الفاظ میں ”اگر بظاہر کفر سے توبہ کر کے اسلامی برادری میں داخل ہو جائیں جس کی بڑی علامت نماز ادا کرنا اور زکوٰۃ دینا ہے تو پھر مسلمانوں کو ان سے تعرض کرنے اور ان کا راستہ روکنے کی اجازت نہیں“ (تفسیر عثمانی، التوبہ، آیت ۵)۔

سید رشید رضا واضح کرتے ہیں کہ اس آیت کا موضوع اسلام کے فرائض و واجبات کا کوئی جامع بیان نہیں، بلکہ صرف قبول اسلام کی دو واضح اور بڑی علامات کا بیان ہے:

ولما كانت شرائع الإسلام القطعية
من فعل وترك كثيرة وكان الكثير منها
لا يتعلق به التكليف في حال الدخول
في الإسلام كالصيام والحج من الأركان
اكتفى باشتراط الركنين الأعظمين ...
موضوع كل منهما بيان ما يشترط للكف
عن قتال المشركين المحاربين لا بيان
لجملة الإسلام وما ينافيه ويعد ارتداد
عنه بعد الدخول فيه.

”چونکہ اسلام کے قطعی احکام از قسم مامورات و
منہیات بہت سے ہیں اور اسلام میں داخل ہوتے
وقت ان میں سے زیادہ تر امور کی بجا آوری کی
ذمہ داری انسان پر عائد نہیں ہوتی، جیسا کہ روزہ اور
حج وغیرہ، اس لیے (قبول اسلام کے لیے) دو سب
سے بڑے احکام پر اکتفا کی گئی۔ آیت اور حدیث کا
موضوع ان شرائط کا بیان ہے جو برسر جنگ مشرکین
کے خلاف قتال سے رکنے کے لیے ضروری ہیں۔
اسلام کے تمام احکام یا اسلام کے منافی یا اسلام سے

ارتداد شمار ہونے والے تمام امور کا بیان ان کا
(المنار ۱۰/۲۰۵-۲۰۶)

موضوع نہیں۔“

سید قطب نے بھی ان آیات سے اور خصوصاً نماز اور زکوٰۃ کے ذکر پر اکتفا سے کسی عمومی شرعی قاعدے کے
استنباط سے اختلاف کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہاں مشرکین عرب کے حوالے سے ایک خاص صورت حال
زیر بحث ہے، اس لیے اس سے اسلام کے سیاسی نظام سے متعلق کوئی عمومی اصول اخذ کرنا درست نہیں۔
جہاں تک نماز اور زکوٰۃ کا تعلق ہے تو سید قطب کے نزدیک اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے علاوہ دیگر احکام کی
پابندی کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا، بلکہ دراصل اس دور میں جو لوگ بھی دائرۃ اسلام میں داخل ہوتے تھے، وہ
پورے کے پورے داخل ہوتے تھے اور ان سے یہ خدشہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ قبول اسلام کی تمام شرائط کو پورا
نہیں کریں گے (فی ظلال القرآن، اردو ترجمہ ۲/۳-۴)۔

یہی رجحان مولانا اصلاحی کا بھی ہے جو نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کو ”اسلام کے نظام عبادت و اطاعت میں داخل
ہونے کی“ ایک جامع تعبیر قرار دیتے ہیں (تدبر قرآن ۳/۵۴۰)۔

مولانا مودودی نے اگرچہ ان آیات سے نو مسلموں کے شہری حقوق کا دستوری ضابطہ اخذ کیا ہے (تفہیم القرآن،

التوبہ، حاشیہ نمبر ۱۴)۔ تاہم مولانا کا استنباط صرف اس نکتے تک محدود ہے کہ یہ شرائط پورا کرنے کے بعد نو مسلموں کو دیگر تمام مسلمانوں کی طرح یکساں شہری حقوق حاصل ہو جائیں گے۔ مولانا اس سے حکومت کے دائرہ اختیار کی تحدید کا نکتہ اخذ نہیں کرتے۔

مصنف کا نقطہ نظر اہل علم کے مذکورہ عمومی رجحان سے مختلف ہے۔ مصنف کے نزدیک یہ آیت اپنے خاص سیاق کے لحاظ سے تو مشرکین عرب سے متعلق آئی ہے اور اس میں اسلام قبول نہ کرنے کی صورت میں ان کے قتل کا حکم اتمام حجت کے قانون پر مبنی ہے، تاہم اس میں ان کی جان بخشی کی جو شرائط بیان کی گئی ہیں، وہ صرف ان کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ یہ بطور مسلمان کسی بھی شخص کے شہری و سیاسی حقوق کے بنیادی شرائط ہیں۔ بہ الفاظ دیگر، مذکورہ شرائط کا ذکر محض قبول اسلام کی علامت کے طور پر یا جان بخشی کی کم سے کم شرائط کے طور پر نہیں ہوا، بلکہ یہاں ایک طرف یہ قرار دیا گیا ہے کہ اسلامی ریاست کے شہری حقوق سے بہرہ مند ہونے کے لیے نماز کا اہتمام اور زکوٰۃ کی ادائیگی ضروری ہے، اور دوسری طرف یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ ان دو مطالبات کی تکمیل کے بعد ایجابی طور پر ریاست ان کو دین کے کسی مزید حکم کی پابندی پر مجبور نہیں کر سکتی۔ مصنف کا استدلال یہ ہے کہ جب مشرکین عرب سے اس سے زیادہ کوئی مطالبہ ریاست کی طرف سے روا نہیں رکھا گیا تو ایک عمومی ضابطے کے طور پر بھی مسلمان شہریوں سے ایسا کوئی مطالبہ درست نہیں ہونا چاہیے۔

البتہ ان شرائط کی عملی تنفیذ کے حوالے سے مصنف کا رجحان یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں حکمت عملی اور مصلحت کا بھی دخل ہے اور نظم اجتماعی ”اگر چاہے تو“ (مقامات، اسلام اور ریاست — ایک جوابی بیانیہ) مسلمانوں سے بہ زور قانون ان کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس اقدام سے کوئی ناپسندیدہ نتیجہ پیدا ہونے کا خدشہ ہو تو اذروے مصلحت اس سے گریز بھی کیا جاسکتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ مشرکین عرب کے لیے جو شرائط درجہ لزوم میں بیان کیے گئے، ان کو ریاستی اختیار کے عمومی دائرے میں منطبق کرتے ہوئے صواب دیدی قرار دینے کی وجہ مصنف کے نزدیک اتمام حجت کا قانون ہے۔ مشرکین عرب کے لیے چونکہ اسلام قبول کرنا لازم تھا، اس لیے قبول اسلام کے شرائط کے طور پر ان سے نماز اور زکوٰۃ کی عملی پابندی بھی لازماً مطلوب تھی اور ایسا نہ کرنے پر ان کے خلاف قتال، گویا لازم تھا۔ تاہم اس خاص دائرے سے باہر عمومی صورت حال میں مسلمان شہریوں پر ان احکام کی تنفیذ مصنف کے نزدیک حکمت عملی کے تحت صواب دیدی ہے۔